پیش لفظ

خدائے لم یزل، ربّ کائنات، الٰہ العالمین کا صد شکر کہ یہ مقالہ آج اس وقت پایۂ تکمیل کو پہنچا جب ربیع الاول کا مبارک مہینہ سعادتوں اور رحمتوں کا خزینہ ارض وسما پر نچھاور کرتے ہوئے اپنے بارہویں دن کی عظمتوں کو دامن میں ڈالنے کے لیے بے قرار ہوا جاتا ہے۔

مرشد گرامی قدر جناب محمد بدر الدجیٰ دامت برکاتہم العالیہ کا فیضانِ نظر تھا کہ مقالہ تکمیل کے مراحل بخوبی پورے کر چکا ہے۔ چند ہفتے پہلے تک یہ امید نہ تھی کہ مقالہ اپنے مقررہ وقت پر ختم بھی ہو سکے گا البتہ اللہ پر توکل ضرور تھا جو بار بار امید کا دامن تھامنے پر مجبور کر دیتا تھا۔ یہ وہی توکل تھا جس کے سہارے زندگی کی ہر منزل پر آسانیاں نصیب ہوئیں اور کامیابیاں قدم چومنے پر مجبور ہو گئیں۔ اسی توکل کے بل پر پی ایچ۔ڈی میں داخلہ لیا تھا اور ہر گزرتے سال میعاد کے بڑھاوے کے لیے درخواست دی تھی اور بالآخر یہ حقیر سی کاوش اپنی تکمیل میں کامران رہی۔

پی ایچ۔ڈی کا یہ سفر اِن چند برسوں پر محیط نہیں تھا جب جی سی یونیورسٹی، لاہور میں رجسٹریشن کروائی تھی بلکہ اس کے پیچھے وہ تمام سال شامل تھے جن میں ایک ایک کر کے تعلیمی درجات طے کیے تھے۔ پہلی جماعت میں داخل ہونے سے دسویں جماعت تک اور پھر گیارہویں جماعت سے لے کر آج تک دو اداروں کے سوا کسی اور جگہ تعلیم حاصل نہیں کی، یہ دو ادارے گورنمنٹ سنٹرل ماڈل سکول، لوئر مال لاہور اور گورنمنٹ کالج لاہور تھے۔ سنٹرل ماڈل سکول کا نام آج بھی وہی ہے جو تیس سال قبل (۱۹۸۴ء جب یہاں پہلی جماعت میں داخلہ لیا) تھا۔ البتہ گورنمنٹ کالج لاہور نے جی سی کالج سے جی سی یونیورسٹی بننے کے دوران میں جہاں اپنی حیثیتیں تبدیل کیں، وہیں اپنا نام بھی بدل ڈالا۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور اور پھر جی سی یونیورسٹی لاہور بننے کے تمام تر مراحل میری آنکھوں کے سامنے طے ہوئے۔ اِن دو اداروں نے میری ذہنی پرداخت کا جو سامان کیا، اس کا احسان چکانا ناممکن سی بات ہے۔

سنٹرل ماڈل سکول کی یادداشتوں کو تازہ کروں تو میڈم کوثر پروین اور اُن کی ہمشیرہ پروین کوثر نے ابتدائی پانچ برس میری ذہنی نشو ونما میں بھرپور حصہ لیا۔ بعد ازاں مولانا عبدالاحد، تاج الدین تاج، عبدالفتاح، محمد ابراہیم، عارف سبحانی اور محمد سلیم قریشی نے اپنے اپنے طور پر علم کے موتی میری جیبوں میں ٹھونسنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ یہاں گزارے دس برس میں نے اسلم حیات، عاطف رسول، طارق وحید، سلمان ظفر، مولانا عبدالاحد کے بیٹوں عبدالرشید اور عبدالوحید، محمد علی، عقیل احمد خان، سلطان محمود (مرحوم)، راشد نذیر چیمہ جیسے دوستوں کی معیت میں زندگی کے نشیب و فراز کو سمجھنے کی کاوش کی۔

گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ میرٹ پر نہیں بلکہ کوٹے پر ملا تھا مگر خوش تھا کہ میں اب راوین تھا مگر یہ خوشی تادیر قائم نہ رہی اور دو برس بعد ہی اِس ادارے کی حدود سے اِس لیے بے دخل کر دیا گیا کیونکہ انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں ناکام رہا تھا۔ البتہ اس

زخم پر جلد ہی اپنے ہاتھوں پھاہا رکھا اور نئے عزم و حوصلے کے ساتھ سال سوم میں داخلہ لیا اور پھر پیچھے مڑ کر نہ دیکھا۔ ابتدائی چار برسوں میں بشیر احمد قادری، پروفیسر ہارون قادر، عبدالرؤف (صحافی)، یوسف بشیر، حافظ شاہد اقبال، حیدر عباس رضوی، عبدالوحید (لائبریرین)، حافظ ثناء اللہ، سرفراز جعفری جیسے علما و اساتذہ نے امتحانوں کے ساتھ زندگی میں کامیابی کا ہنر عطا کیا۔ بعد ازاں شعبہ اردو سے وابستہ ہوا تو پروفیسر ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، پروفیسر ڈاکٹر سہیل احمد خان، پروفیسر ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، ڈاکٹر حق نواز، ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر عبدالرزاق، ڈاکٹر احسان الحق، ڈاکٹر سید طارق حسین زیدی، ڈاکٹر ثاقف نفیس، ڈاکٹر شفیق عجمی، پروفیسر ڈاکٹر سعادت سعید، ڈاکٹر اصغر ندیم سید، ڈاکٹر اختر علی میرٹھی، ڈاکٹر سعید مرتضیٰ زیدی (مرحوم) سے باقاعدہ اکتساب کا موقع ملا اور ان میں سے ہر ایک نام ایسا ہے جن سے نشست و برخاست اردو ادب کے طالب علم کی خواہش رہتی ہے مگر اکثر کے لیے یہ حسرت بن جاتی ہے۔ میرے اندر جس قدر تنقیدی، تحقیقی یا تخلیقی صلاحیتیں پائی جاتی ہیں، وہ وہبی ہرگز نہیں ہیں بلکہ انہی اساتذہ کرام کے رحم و کرم کی مرہونِ منت ہیں۔ اس لیے اگر مقالے میں کوئی قابلِ تحسین چیز ہے تو اس کا سہرا ان اساتذہ کرام کے سر ہی بندھنا چاہیے، البتہ خامیاں یقیناً میری ذات سے اس لیے وابستہ کی جانی چاہئیں کیونکہ میں ان علم کے سمندروں سے زیادہ اکتساب نہ کر سکا۔ ڈاکٹر محمد سعید، ڈاکٹر خالد سنجرانی، محمود الحسن بزمی، واصف لطیف، سفیر حیدر، پروفیسر امتیاز احمد نے نہ صرف قدم قدم پر میری حوصلہ افزائی کی اور پر خلوص دعاؤں سے نوازا بلکہ اپنی تنقیدی و تحقیقی صلاحیتوں میں سے بہت کچھ حاصل کرنے کا موقع دیا۔ ان عظیم ہستیوں کا ذکر کیے بغیر کچھ آگے بڑھنا میرے لیے قریب قریب ناممکن تھا۔

آئندہ صفحات میں جو مقالہ پیش کیا جا رہا ہے، اس کا عنوان ''اردو افسانے میں عائلی زندگی'' ہے جو افسانوی دائرے میں رہتے ہوئے بھی بیکرانی کا حامل ہے۔ عائلی زندگی کے بے شمار مظاہر ہیں جن میں سے کئی مظاہر کو اردو افسانے میں پیش کرنے کی ہر عہد اور تحریک میں کوششیں ہوتی رہیں۔ اردو افسانے کی یہ خصوصیت ہے کہ دیگر اصناف کی نسبت اس نے بہت جلد وہ مقام حاصل کر لیا کہ اسے بین الاقوامی افسانے یعنی فرانسیسی، جرمن، امریکی اور روسی افسانے کی صف میں شامل کیا جانے لگا۔ افسانے کی ایک تعریف یہ کی جاتی ہے کہ یہ وہ مختصر نثری تصنیف ہے جس میں انسانی زندگی کوئی ایک پہلو اجاگر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ انسانی زندگی کا ایک اہم ترین پہلو اہل و عیال اور خانگی زندگی سے متعلق ہے جس کے تحت انسان فرد سے اجتماع کی طرف سفر اختیار کرتے ہوئے معاشرتی زندگی کی بوقلمونیوں کا تجربہ کرتا ہے۔ چونکہ ادب کی بنیاد معاشرے پر قائم ہے اور عائلی نظام کسی بھی معاشرے کی بنیادی اکائی کے طور پر کام کرتا ہے، اس لیے جب ہم اس حوالے سے اردو افسانے پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں اس کا دامن عائلی زندگی کے مختلف النوع مناظر سے بھرا ہوا نظر آتا ہے۔ لہٰذا اس امر کی ضرورت محسوس ہوئی کہ اردو افسانے کی تقریباً صد سالہ روایت سے ایسے افسانوں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ لیا جائے جن میں عائلی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہو۔ ساتھ ہی ساتھ اس امر کا اندازہ بھی لگایا جائے کہ کس طرح وقت بدلنے کے ساتھ ساتھ عائلی زندگی کے بدلتے رنگ افسانوں میں دکھائی دیتے ہیں اور کس طرح افسانہ نگاروں نے اپنے تجربات و مشاہدات کو اپنے تخیل کی بنیاد پر قلم بند کرنے کی کوشش کرتے

ہوئے عائلی زندگی کے مسائل ومباحث کو بیان کیا ہے۔

مطلوبہ مقاصد ونتائج حاصل کرنے کے لیے مذکورہ مقالے ''اردو افسانے میں عائلی زندگی'' کو چھ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے باب کا عنوان ''عائلی زندگی — تعارف، تاریخ اور اہمیت'' میں لفظ عائلہ اور عائلی کے ماخذ تلاش کرنے کے ساتھ ساتھ دیگر زبانوں میں اس امر کے لیے مستعمل الفاظ کو بھی تلاش کیا گیا ہے۔ اسی طرح عائلی زندگی کی تاریخ کا کھوج لگاتے لگاتے اس کی ابتدا کا سراغ پانے کی کوشش کی گئی ہے اور اس امر کے لیے مختلف تہذیبوں میں رائج عائلی روایات اور قوانین کا جائزہ بھی لیا گیا ہے اور مختلف مذاہب کے ہاں پائے جانے والے عائلی نظریات کا تذکرہ بھی اجمالی طور پر کیا گیا ہے۔ پھر خاص برصغیر کی عائلی روایتوں کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اسلامی نظامِ حیات میں عائلی زندگی کی اہمیت وضرورت پر خاص روشنی ڈالی گئی ہے۔

دوسرا باب ''ابتدائی / رومانی افسانے میں عائلی زندگی'' کے عنوان سے قائم کیا گیا ہے جسے رومانی اور حقیقت پسند افسانے میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ یہاں رومانی افسانہ نویسوں کی خصوصیات پر صفحات سیاہ کیے گئے ہیں اور نہ ہی حقیقت پسند افسانہ نگاروں کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے تاریخ وتنقید کو خواہ مخواہ کھنگالا گیا ہے۔ البتہ جہاں تہاں اس امر کی ضرورت محسوس ہوئی، وہاں چند الفاظ واقتباسات کی مدد ضرور لی گئی ہے۔ یلدرم، نیاز فتح پوری اور مجنوں گورکھپوری کو رومان پسندوں کی فہرست سے منتخب کیا گیا ہے اور پریم چند، سدرشن اور علی عباس حسینی کو حقیقت پسندوں کا نمائندہ خیال کرتے ہوئے دونوں طرح کے ادیبوں کے افسانوں سے عائلی زندگی کے نقوش اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسی طرح تیسرا باب جسے ''ترقی پسند افسانے میں عائلی زندگی'' کا عنوان دیا گیا ہے، میں منٹو، کرشن چندر، بیدی، عصمت اور احمد ندیم قاسمی کو بطور نمائندہ افسانہ نگار چنتے ہوئے ان کے افسانوں میں موجود عائلی زندگی کے مسائل اور رویوں کا مطالعہ کیا گیا ہے۔

مذکورہ مقالے کا چوتھا باب ''عبوری افسانے میں عائلی زندگی'' کے عنوان سے قائم کیا گیا ہے جس میں عبوری یا غیر وابستہ افسانے کی خصوصیات کا اجمالی سا جائزہ لے کر غلام عباس، قدرت اللہ شہاب، ممتاز مفتی، اشفاق احمد، بانو قدسیہ اور قرۃ العین حیدر کے افسانوں میں موجود عائلی زندگی کی تصویروں کی تشریح وتوضیح کرنے کی اپنی سی کوشش کی گئی ہے۔ پانچواں باب ''جدید افسانے میں عائلی زندگی'' کے عنوان سے قائم کیا گیا ہے جس میں جدید افسانے کی خصوصیات اور حدود وقیود کا اختصار سے تعین کرتے ہوئے انتظار حسین، رشید امجد اور منشا یاد کے افسانوں میں موجود عائلی زندگی کے مسائل اور افراد کے عائلی رویوں پر تنقیدی وتحقیقی نگاہ ڈالنے کی سعی کی ہے جب کہ، آخری باب کا عنوان ''اردو افسانے کی مجموعی روایت میں عائلی زندگی'' ہے جس میں نہ صرف تمام تر ابواب کا جائزہ پیش کیا گیا ہے بلکہ اردو افسانے کی مجموعی روایت کا جائزہ لے کر مقالے کے عنوان ''اردو افسانے میں عائلی زندگی'' پر قولِ فیصل دینے کی کوشش کی گئی ہے۔